تحقیقی مجلہ "تصدیق"، شعبہ اردو، رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی فیصل آباد
جلد02 شمارہ04، 2022
eISSN: 2707-6229
pISSN: 2707-6210

CC BY
OPEN ACCESS

عرفان علی مجاہد
ایم فل اردو، اسٹیٹ آفیسر، گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی، فیصل آباد
ڈاکٹر بشریٰ علم الدین
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی، فیصل آباد کیمپس
ڈاکٹر شازیہ عندلیب
خواجہ فرید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی، رحیم یار خان

Irfan Ali Mujahid **Email:** irfanansari@gcwuf.edu.pk
M.Phil. (Urdu), State Officer, Govt College Women University, Faisalabad
Dr Bushra Ilmuddin **Email:** bushra.ilum@riphahfsd.edu.pk
Assistant Professor, Riphah International Unversity, Faisalabad Campus
Dr Shazia Andleeb **Email:** scholargcwuf@hotmail.com
Khwaja Fareed University of Engineering and Information Technology, Rahimyar Khan

ناول لہو رنگ فلسطین ماضی، حال، مستقبل کے تناظر میں

THE NOVEL LAHOO RANG PALESTINE IN THE CONTEXT OF THE PAST, PRESENT, AND FUTURE

DOI: https://doi.org/10.56276/tasdiq.v4i02.86

ABSTRACT

Lahoo Rang Falestine is very important in novel writing. It shows the change in every field of life on a global scale. These important changes have taken place at the political, economic, cultural, social, and cultural levels and have affected the entire era. In the present era, many traditions and values have been broken and at the same time, the system that has been going on for years has been disrupted. There have been many losses but some good results. People's thoughts and feelings changed. In this novel, along with science and art, some movements also took place, which affected the intellect and consciousness of the present age. A new philosophical perspective on life began and these new ideas, and thoughts seemed to be in tune with the old traditions. During this period, complex issues of minorities, exploitation of minorities, sectarianism, political corruption, youth issues, the crisis of civilization and values, and misdeeds of the ruling class began to be written on the page. Novel writing has been the cradle of civilization from the very beginning. Various arts flourished in it. Literature, philosophy, history, etc. in

KEYWORDS

Salma Awan, Palestine, War, Battle, Change, Global, History, Style, Language

Received: 04-Jul-22
Accepted: 28-Dec-22
Online: 30-Dec-22

Urdu got extraordinary development. India has been a land of development of various disciplines in which literature has special significance. Different languages are spoken here and different languages have their literary capital. The novel is considered a style of storytelling anyway. The novel is a genre of literature that is very interesting because the canvas of the novel is much wider than other genres of literature.

"لہو رنگ فلسطین" ناول نگاری میں نہایت اہمیت کا حامل ہے اس میں عالمی سطح پر زندگی سے متعلق ہر شعبہ میں تبدیلی دکھائی گئی ہے۔ یہ اہم تبدیلیاں سیاسی، معاشی، تہذیبی، سماجی اور ثقافتی سطح پر ہوئی ہیں اور اس نے پورے عہد کو متاثر کیا۔ موجودہ دور میں بہت سی روایتیں اور قدریں ٹوٹیں اور اس کے ساتھ ہی برسوں سے چلا آرہا نظام بھی درہم برہم ہوا ہے۔ بہت سے نقصانات بھی ہوئے ہیں لیکن کچھ اچھے نتائج بھی سامنے آئے۔ لوگوں کی فکر اور محسوسات میں تبدیلی آئی۔ اس ناول میں علوم وفنون کے ساتھ کچھ تحریکات بھی رونما ہوئیں جس نے عہد حاضر کے عقل وشعور کو متاثر کیا ہے۔ زندگی کے بارے میں نئے فلسفیانہ زاویہ کا آغاز ہوا اور یہ نئے خیالات، افکار پرانی روایتوں سے ہم آہنگ نظر آئے۔ اس دور میں اقلیتوں کے پیچیدہ مسائل، اقلیت کا استحصال، فرقہ پرستی، سیاسی بدعنوانیاں نوجوانوں کے مسائل، تہذیب اور اقدار کا بحران، حکمران طبقہ کی بدکرداریاں صفحۂ قرطاس پر اتارنے کی جسارتیں شروع ہوئیں۔ ناول نگاری ابتدا ہی سے تہذیب کا گہوارہ رہا ہے۔ اس میں مختلف فنون لطیفہ کو عروج حاصل ہوا۔ اردو میں ادب، فلسفہ، تاریخ وغیرہ کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔ ہندوستان مختلف شعبہ علوم کے نشوونما کی سرزمین رہی ہے جس میں ادب کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ یہاں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں اور مختلف زبانوں کا اپنا ادبی سرمایہ ہے۔ ناول کو ویسے بھی قصہ گوئی کا ہی اسلوب سمجھا جاتا ہے۔ ناول ایک ایسی صنف ادب ہے جو انتہائی دلچسپ ہے کیونکہ دوسری اصناف ادب کے مقابلے میں ناول کا کینوس کافی وسیع ہوتا ہے۔ یہ اپنے اندر کافی گہرائی اور وسعت رکھتا ہے۔ اسی گہرائی کو سلمٰی اعوان نے دردناک المیہ کی صورت میں اپنی فکر میں ڈھال کر بیان کیا ہے۔ یہ المیہ صرف مسلم معاشرے سے مخصوص ہے اور یہ ضروری نہیں کہ وہ ردعمل جو کسی متعین معاشرے سے مخصوص ہو عالمگیر صداقت بھی رکھتا ہو۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فلسطین کا المیہ ہونا کسی متعین معاشرے کا مذہبی وجذباتی ردعمل ہے یا اس دعوے کے پیچھے ٹھوس تاریخی اور زندہ حقیقتیں بھی موجود ہیں اور اس پہلو سے قطع نظر کہ فلسطین کے باب میں عرب یا مسلم معاشرے یا یہودی اور صیہونی معاشرے کا مذہبی وجذباتی تاثر کیا ہے۔ کیا اس مسئلے پر غیر جانبدارانہ موقف سے بھی غور کیا جانا ممکن ہے جو کسی مذہبی وجذباتی تاثرات کے دائرے سے باہر ہو؟ لہو رنگ فلسطین ایسا ہی ناول ہے جس میں غیر جانبداری سے معاشرتی سطح پر مختلف خاندانوں کا آپس میں گہرا ربط دکھایا گیا ہے۔ چاہے وہ خاندان یہودی ہوں، عیسائی ہوں یا پھر مسلمان۔ درج ذیل اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"یرڈینا میری بچی اپنے گھر بار، اپنی زمین، اپنے ڈھور ڈنگر، اپنے باغ باغیچے جس کی ہر پرت میں کچھ کرتے، کچھ بنانے، زندگی کو

بنانے کے رنگ ڈھنگ کی تفصیل جو یادوں کی صورت میں نس نس میں رچ بس جاتی ہے۔ ان سب سے آپ کا رشتہ کٹ جائے تو کوئی آپ سے زیر وزبر دستی آپ کا گھر چھین لے اور آپ کو گولیوں سے بھون دے۔"(۱)

فلسطین کا علاقہ تین بڑے مذاہب یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے مقدس مقامات پر مشتمل ہے اس طرح اس کی دوسری حیثیت یہ کہ وہ ایک خاص زبان اور خاص فکر رکھنے والی قوم کا وطن ہے اور صدیوں سے اسی قوم کا وطن رہا ہے لہٰذا فلسطین کے مسئلے کی جڑ اس کی پہلی حیثیت ہے کیونکہ فلسطین عیسائیت اور اسلام کی طرح تاریخی حیثیت سے یہودیت سے قریبی طور پر وابستہ ہے لیکن یہودیت سے اولین طور پر عیسائیت سے ثانوی طور پر۔ فلسطین کی وابستگی کی اس تاریخی حقیقت کے باوجود فلسطین کا رخ کہ وہ متعدد صدیوں سے ایک قوم کا وطن بھی ہے اپنی جگہ ایک زندہ حقیقت ہے یعنی مسئلے کی نوعیت یہ ہے کہ یہودیوں عیسائیوں اور مسلمانوں کے لیے تاریخی اور مذہبی اہمیت رکھنے کے ساتھ ہی وہ صدیوں سے عربوں کا وطن بھی رہا ہے۔ اس حوالے سے ناول "لہو رنگ فلسطین" کا درج ذیل اقتباس دیکھیے:

"ارے یہ فلسطین کب ہے؟ یہ تو کنعان ہے۔ ہم اسرائیلی جنہیں یہ فلسطینی عبرانی کہتے ہیں یہ تو مسیح سے بھی کہیں پہلے یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔ کتنا دربدر پھرے ہم۔ کتنے ظلم سہے کس کس قوم نے ہماری نسل کشی نہیں کی؟ صدیوں پر پھیلی تاریخ کھول کر دیکھ لو۔"(۲)

تاریخی اور مذہبی اہمیت رکھنے کے ساتھ ہی وہ صدیوں سے عربوں کا وطن بھی رہا ہے اور یہ عرب مسلمان ہیں۔ مطلب اس کا واضح طور پر یہ نکلا کہ تاریخی اور مذہبی اعتبار سے تو یہودی، عیسائی اور عرب مسلمان تقریباً یکساں طور پر فلسطین کے حقدار ٹھہرتے ہیں لیکن ایک قوم کا وطن ہونے کے اعتبار سے عرب مسلمانوں کا فلسطین کے حقدار ٹھہرتے ہیں لیکن ایک قوم کا وطن ہونے کے اعتبار سے عرب مسلمانوں کا فلسطین پر جو حق بنتا ہے وہ دوسرے دو فریقوں کی بہ نسبت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ درج ذیل اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"میری جان یہی راستہ سلامتی اور نجات کا ہے۔ رہا فلسطین جذبات سے اوپر اٹھو۔ یہ تو ایک طویل جدوجہد ہے۔ قوموں کے فیصلے سالوں میں نہیں کہیں صدیوں میں جا کر ہوتے ہیں۔ ظلم، جبر، زیادتیوں، ناانصافیوں اور دیگر عوامل کے انبار جمع ہوتے رہتے ہیں۔ تہہ در تہہ پھر کہیں جا کر دراڑیں پڑتی ہیں۔ زوال پذیری کا عمل شروع ہوتا ہے اور پھر کہیں قوموں کے مقدر جاگتے اور کہیں سو جاتے ہیں۔"(۳)

یہ تاریخی اصول ہر گز نہیں ہے کہ جو علاقے مذہبی حوالے سے مقدس ہوں وہ لازمی طور پر اسی مذہب کے ماننے والوں کے حوالے بھی کر دیے جائیں مثلاً اگر صورت یہ ہوتی کہ فلسطین کے ساتھ کوئی مذہبی رشتہ نہ ہوتا اور وہ صرف عربوں کا وطن ہی ہوتا تو بھی یہ مطالبہ نہ کیا جا سکتا تھا کہ فلسطین سے عربوں کو نکال کر یہودیوں کو ان کی جگہ بسا دیا جائے صورت یہ ہوتی تو یہودی صرف اتنا مطالبہ کر سکتے تھے کہ فلسطین کے مقدس مقامات کی زیارت اور اپنے رسوم مذہبی کی دائیگی کی انہیں مکمل آزادی حاصل ہونی چاہیے۔ نہ یہ کہ فلسطین کے

قدیم باشندوں کو وہاں سے نکال کر پورا علاقہ یہودیوں کی حکمرانی میں دے دیا جائے۔ ویسے بھی یہودیوں کی طرف سے اس قسم کا کبھی اعتراض نہیں کیا گیا کہ عربوں یا مسلمانوں نے فلسطین پر اپنی سیادت کے دوران کبھی بھی ان کو ان فرائض مذہبی کی بجا آوری سے منع کیا ہو بلکہ مسلم معاشروں میں تو عیسائی معاشروں کے برخلاف یہودیوں کے بارے میں ہمیشہ گوشۂ عافیت موجود رہا ہے چنانچہ خالص مذہبی اور عبادتی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو پہلی جنگ عظیم تک یہودی اکثریت فلسطین پر مسلم اقتدار کی صورت حال پر برابر مطمئن رہی اور اسے فلسطین پر قبضہ کرنے کی کوئی مذہبی ضرورت پیش نہ آئی۔ درج ذیل اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> "مگریر ڈینا مسلمان اتنے ظالم کبھی نہیں رہے۔ عمر بھی تاریخ میں درج ہے اور عثمانی سلاطین بھی یر ڈینا اپنی لمبی پوروں سے آنکھوں کے گیلے گوشوں کو خشک کرتی۔ یر ڈینا سے زیادہ بھلا کون ان جذبات کو سمجھ سکتا تھا۔ سٹی میئر Shabtai Levy شیتی لیوی سے منصور کے دادا کی بہت یاری ہے۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ سلسلہ گفتگو پھر جوڑتی۔ وہ کئی دوسرے لیڈروں کے ساتھ میرے گھر آئے۔"(۴)

مسئلہ فلسطین کے خالص مذہبی یا عبادتی پہلو کے بعد غور طلب دوسری بات یہ ہے کہ اگر اس مسئلہ کو ماضی کے جذبے کی روشنی میں دیکھا جائے جس کی صیہونیت نمائندگی کرتی ہے تو پھر صورت حال ایک بالکل دوسرا رخ اختیار کر لیتی ہے یعنی صیہونیت کی تحریک کا مدی قرار پانے والی بات یہ ہے کہ ان کے نزدیک خدا نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ وہ فلسطین کا پورا علاقہ سلطنت موعودہ کے طور پر واپس کرے گا۔ یہ ایک ان کی سوچ کا خطرناک انداز ہے اس لیے کہ یہ حکومت موعودہ صرف فلسطینی علاقوں تک محدود نہیں رہے گی اس لیے کہ اس وعدے میں تو ازنیل قافرات کے سارے علاقے شامل ہوں گے جیسا کہ صیہونی تحریک کے قائدین کا بیان ہے دوسرے یہ کہ سلطنت موعودہ جو جنت ارضی کی نمائندہ ہو گی کیوں عرب کے علاقوں تک ہی محدود رکھی جائے گی؟ کیوں نہ اس کے دائرے میں ساری انسانیت آجائے؟ آخر خدا کی منتخب قوم ہونے کے اعتبار سے یہودیوں پر یہ فرض بھی تو عائد ہوتا ہے کہ وہ سارے کرۂ ارض کو بہشت ارضی میں بدل ڈالیں لیکن بات اس نقطے پر آکر ٹھہرے تو پھر یہ سمجھنا مشکل ہے کہ صیہونیت اور جرمن ناتسیت میں کیا فرق باقی رہ جائے گا۔ ہٹلر کے ہم قوم بھی دنیا کی برتر قوم تھی اور یہودی تو بہر حال اپنے عقیدے کی وجہ سے خدا کی چنی ہوئی قوم تھی۔ اور بات یوں ہو تو پھر ایک فلسطینی عربوں کا وطن ہی نہیں چھینا ممکن ہو سکا تو غیر یہودی اقوام اپنی آزادی سے محروم کر دی جائیں گی اور یہودیوں کی بہشت ارضی میں رہنے سے انکار کی جسارت کی تو اپنے وطنوں سے نکال باہر کی جائیں گی۔ بات یہ ہے مذہبی آزادی اور عبادتی حقوق کا احترام اپنی جگہ لیکن یہ اصول تو محض جنگل کا قانون ہے کہ کسی مذہبی گروہ کو ان علاقوں کے باشندوں کو ان کے گھروں سے نکال دینے کا حق حاصل ہے جہاں اس مذہبی فرقے کے مقدس مقامات واقع ہیں۔ فلسطین عربوں کا وطن ہے اور وطن کے ناتے فلسطین پر ان کا حق مقدم ہے۔ فلسطین میں عربوں کے مقدس مقامات واقع ہونے کی بنا پر فلسطین کو عرب سلطنت کا حصہ ہونا چاہیے۔ موقف ان کا یہ ہے کہ ان کا وطن ہے اور اس لیے اس میں رہنے اور حکومت کرنے کا حق انہیں حاصل ہے گویہ ان کی ذمہ داری رہی ہے اور اگر ان کی عملداری ہو تو آئندہ بھی رہے گی

کہ فلسطین سے متعلق مذہبی گروہوں کے مذہبی اور عبادتی حقوق کا پورا پورا تحفظ کریں اور اس ضمن میں ہر ضروری ضمانت بھی مہیا کریں۔ درج ذیل اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"صدیوں پر پھیلی تاریخ کھول کر دیکھ لو۔ کہیں فرانسیسیوں نے کہیں ان اچکے روسیوں نے۔ یہ منحوس مارے انگریز جنہوں نے ہمیں زمینیں خریدنے اور کاشت سے روکا ہنری دوم اور سوم نے ہم سے لاکھوں پونڈ بھی لیے اور ہمارے ماتھے پر شناخت کا ٹیکا لگوا کر ہمارا عام لوگوں کے ہاتھوں پٹڑا بھی کروایا۔ یہی اس کمینے فرانس کے شاہ فلپ نے کیا۔ یہودیوں کو جیلوں میں بھی ٹھونسا۔ ان سے پیسہ بھی لیا اور انہیں دیس بدیس بدر بھی کیا پرتگالیوں کے بھی رویے ایسے ہی تھے۔ جرمنوں کمینوں نے سبھوں کو مات دے دی۔ ان کے عیسائی پادری تو ملنگا یہ اقرار کرواتے۔"(۵)

عرب موقف واضح طور پر معقولیت پسندانہ ہے جس کی کوئی ذی ہوش مخالفت نہیں کر سکتا۔ اصولاً اس قطعی جائز اور منصفانہ موقف کو یہودی قوم کو مان لینا چاہیے لیکن پچھلی کوئی ایک صدی سے یہودی قیادت اس جائز صورت حال کو قبول کر لینے کے لیے تیار ہی نہیں جس کی وجہ سے بین الاقوامی توازن ان کے حق میں آتا چلا گیا۔ مگر یہ بات بھی سچ ہے کہ طاقت کے توازن کو بطور دلیل ہر گز پیش نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ایسا کرنے سے کسی بھی مذہبی گروہ کے لیے کبھی بھی پسندیدہ صورت حال قرار نہیں دی جائے گی۔ لیکن حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ پرجوش مذہبی گروہ مذاہب کی انسان دوستی کو کم ہی کاطر میں لایا کرتے ہیں اور اسی مذہبی جوش میں اکثر دلیل کو طاقت کا مطیع بنا کر پیش کر دیا جاتا ہے بنا یہ سوچے سمجھے کہ اس طرح وہ گروہ اپنے روحانی پہلو کو خود اپنے ہاتھوں ذبح کر دے گا۔ ایسی سوچ بڑی المناک ہے لیکن یہودیوں کی حد تک تو یہ انداز نظر مآلِ کار بڑا تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ کوئی کتنی ہی بڑی کوشش کر لے یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ عربوں کی ترقیاتی حرکت کو روکا جا سکے۔ یہودیوں کا یہ المیہ بھی ماضی میں رہا ہے کہ وہ مختلف اقوام کی دشمنی کے دباؤ میں پستے رہے ہیں لیکن اب یہ نئی بدقسمتی ہے اپنے تک لا رہے ہیں کہ ادھر جبکہ وہ ایک طرف مغربی اقوام کی مخالفت سامیت تحریک کی زد میں ہیں تو دوسری طرف ایک ارب مسلمانوں کی دشمنی مول لینے پر بضد ہیں جب کہ قرون وسطیٰ میں اس مخالف سامیت تحریک سے پناہ دینے کے لیے مسلم دنیا ہی ان کا واحد سہارا بن کر سامنے آئی تھی۔ اب اگر طاقت کے توازن ہی کو آخری دلیل کے طور پر اسرائیلی قیادت نے اختیار کر لیا ہے تو وہ وقت دور نہیں جب یہ دلیل عربوں کی تائید میں آجائے گی اور اس وقت اسرائیل کے جنون زدہ حکمرانوں کو اندازہ ہو گا کہ انہوں نے کونسا راستہ اختیار کیا تھا جو انہیں منزل سے بہت دور لے گیا ہے۔

"اب یر ڈینا صرف عربی سمجھ لیتی تھی بلکہ اچھی خاصی بول بھی لیتی تھی۔ ضالیہ کی ساس کی محبت سے لطف اٹھاتی ان سے ان کی جوانی کے دنوں کی کہانیاں سنتی۔ یوسف ضیا جیسے بڑے صاحب علم کے ساتھ زندگی گزارنے کے تجربے کا احوال سنتی، کہیں کہیں چسکے لیتی۔ کہیں ملول ہوتی۔ پرانے ٹوٹے ٹوٹکے پوچھتی۔ اسے ان سے گپ شپ کر کے بہت لطف آتا۔ اس کی ماں جب وی آنا ان کے گھر آتی تھی ان کا دیا ہوا وہ بے مثل تحفہ طلائی پازیب یر ڈینا کے پاس تھی۔"(۶)

فلسطین کی صورت حال کے بارے میں گزشتہ چند دہائیوں میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اردو میں بھی اس مسئلے میں کافی کچھ لکھا جاچکا ہے لیکن ایسا نسبتاً کم ہی ہوا ہے کہ صورت حال کا معروضی اور غیر جذباتی اندازہ لیا گیا ہو۔ سلمیٰ اعوان کے ناول "لہو رنگ فلسطین" میں فلسطین کے پس منظر، منظر اور پیش منظر تینوں مراحل کا بخوبی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس حوالے سے درج ذیل اقتباس ملاحظہ کیجیے:

" ماضی:" اور دونوں کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے جب وہ روتے ہوئے کہتی تھی۔ جی چاہتا ہے شاعر سے پوچھوں تمہارا گھر اور اس میں زیتون کا پیڑ بچے ہوں گے تو ان پر کچھ لکھو گے اور پوچھو گے جب مکین اور گھر ہی بدل جائیں گے تو لکھا ہوا کس کے پاس لے کر جاؤ گے مگر ڈینا مسلمان اتنے ظالم کبھی نہیں رہے عمر بھی تاریخ میں درج ہے اور عثمانی سلاطین بھی۔"(۷)

" حال" پھر وہ توفیق زید کی شاعری اسے سناتیں۔

میں زمین کے اس ٹکڑے پر اس کا نام ضرور لکھوں گی
جس پر قبضہ کر لیا گیا
میرے گاؤں کا نقشہ جہاں پھیلا ہوا تھا
کیسا کیس اگھر اجڑ گیا
کیسا کیسا درخت لٹ گیا کتنے خوبصورت جنگلی پھول پامال ہو گئے۔"(۸)

"مستقبل:" پھر وہ یائل کے گھر آئی۔ کتنی دیر گیٹ پر کھڑی رہی ماضی آنکھوں کے سامنے چکریاں کاٹتا تھا۔ اس گھر پر ہمیشہ بڑا سناٹا رہتا تھا۔ وہ بہن بھائی جب آتے تب شامیش کے ساتھ مل کر خوب ہلا گلا ہوتا۔ اس گھر میں قہقہے گونجتے۔"(۹)

لہو رنگ فلسطین میں ماضی حال مستقبل کے حوالے سے فکر کا جائزہ لیا جائے تو فلسطین کی تاریخ میں سلطنت عثمانیہ کے زوال کی بڑی اہمیت ہے۔ انیسویں صدی عیسوی کے آخری عشروں میں اندرونی ریشہ دوانیوں اور بیرونی سازشوں کے نتیجہ میں سلطنت عثمانیہ کی جڑیں کمزور ہو چکی تھی۔ اپنے انتہائی عروج کے دور میں یہ سلطنت بغداد تک اور نیل کے ساحل تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ نہ صرف جدید عہد کی سب سے بڑی مسلم ریاست تھی بلکہ اس کا شمار تاریخ کی عظیم ترین اور مدت کے اعتبار سے طویل ترین مسلم مملکت میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ سوا چھ سو برس میں مختلف سلاطین حکمران رہے جو بنیادی طور پر فوجی بادشاہت تھی اس دور میں اگرچہ یہ مختلف شعبوں میں بڑے اچھے کام کر رہی تھی مگر سلطنت کی ہیئت شخصی حکمرانی اور مطلق العنانی کی تھی محکوموں میں عرب، شامی، عراقی، مصری، بربر، کرد، آرمینی غرضیکہ یورپ اور مغربی ایشیا کی بیشتر قومیں شامل تھیں۔ ان سب کے اپنے اپنے رسم رواج تہذیب و تمدن مذہب اور زبانیں تھیں اس سخت گیر نظام کا واسطہ جب یورپ میں جغرافیائی حد بندیوں سے پڑا تو مشکلات نے اس ریاست کو ختم کرنے کی بنیادیں فراہم کیں۔ دارالخلافہ کی عدم دلچسپی درباری سازشوں اور عمال حکومت کی بے حسی کے نتیجے میں عوام کی زندگی اجیرن ہوتی چلی گئی۔ مختلف وبائی امراض نے مزید پریشانیوں سے دوچار کیا۔ پھر یورپی طاقتوں کی مداخلت کی وجہ سے تو ترکوں کا اثر و رسوخ کم ہوتا چلا گیا۔ لبنان اور فرانس

کے معاملات میں فرانس نے براہ راست عمل دخل حاصل کر لیا۔ جنوبی ایشیا میں برطانوی تجارتی مفادات اور پھر نو آبادیاتی نظام کے قیام کے بعد تو مغربی ایشیا کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی۔ پرتگیزیوں کو جنوبی ایشیا سے نکال کر جب برطانوی حکومت کو اطمینان حاصل ہوا تو اس نے مغربی ایشیا کے عرب ممالک کی طرف اپنی توجہ مبذول کی کہ انگلستان اور جنوبی ایشیا کے درمیان زمینی اور بحری راستے اسی علاقے سے گزرتے تھے۔ بیسویں صدی کے آغاز پر ترکی کی سلطنت عثمانیہ تیزی سے روبہ زوال تھی ادھر سلطنت کے عرب علاقوں میں برطانوی اور فرانسیسی سازشیں اپنے عروج پر پہنچ چکی تھیں۔ لارنس جیسے زیرک اور شاطر انگریز ایجنٹ عربوں کے درمیان رہ کر انہیں ترکوں کے خلاف بغاوت پر اکساتے رہے اور سلطنت عثمانیہ کو اندرونی خلفشار میں پھنسایا تاکہ یورپ میں اسی کی قوت مفلوج ہو کر رہ جائے اسی اثنا میں پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا اور شکست کھائی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یورپ کی استعماری طاقتوں نے سلطنت عثمانیہ کو اس کے بیشتر مقبوضات سے محروم کر دیا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران ہی برطانیہ نے عربوں کو آزادی کا لالچ دے کر انہیں اپنی حمایت کا یقین دلایا اور اس طرح والی امیر شریف حسین نے برطانیہ سے غیر مشروط وعدے کا مطالبہ کیا۔ برطانیہ جہاں عربوں کو لالچ دے رہا تھا وہیں وہ سلطنت عثمانیہ کو اپنے حلیفوں کے ساتھ مل کر شکست پہ شکست دیتا چلا جا رہا تھا۔ جنگ عظیم کے ختم ہونے کے بعد برطانیہ کو عربوں کی حمایت کی مزید ضرورت نہ تھی اور مسلمانوں کے خلاف ان کا عناد کھل کر سامنے آنے لگا۔

درج ذیل اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> "اس ضمن میں یہ ملحوظ رہے کہ عرب کاز کے لیے عالم یہود کی دوستی ان تمام ملکوں کی حمایت کے برابر ہے جہاں جہاں یہودیوں کو سیاسی اثر ورسوخ حاصل ہے۔ تحریک کے رہنما عربوں کے ساتھ دوستی اور تعاون کے ذریعہ صیہونیت کی کامیابی کا عزم کیے ہوئے ہیں اور یہ ایسی پیش کش ہے جسے آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔"(۱۰)

اس سال برطانیہ اور فرانس کی حکومتوں نے مشترکہ کمیشن بنا جس کا کام یہ تھا کہ جنگ کے دوران عربوں کے ساتھ کیے گئے وعدوں پر از سر نو غور کر کے کوئی مناسب لائحہ عمل طے کرے اسی غرض سے یہ کمیشن مقرر کیا گیا اور اس کمیشن کا مشترکہ اعلانیہ جاری کیا گیا جس کا کچھ حصہ درج ذیل ہے:

> " ان (فرانس اور برطانیہ) کی کوئی خواہش نہیں ہے کہ ان علاقوں کی آبادی پر کوئی مخصوص قسم کے ادارے تھوپے جائیں ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ ان علاقوں کے عوام کی اپنی آزادانہ مرضی سے منتخب حکومتوں اور انتظامیہ کو پوری مدد دی جائے تاکہ وہ ٹھیک طرح کام کر سکیں۔ سب کے لیے ساری اور غیر جانبدارانہ انصاف کا حصول مقامی پہل کی حوصلہ افزائی کر کے ان کو معاشی ترقی میں مدد دینا، تعلیم کی ترویج اور مقامی آبادی کے آپس کے اختلافات کو رفع کرنا جن کا سابق ترک حکومت فائدہ اٹھاتی رہی۔"(۱۱)

اسی اثنا میں طاقتور اور بااثر یہودی لابی کی مسلسل کوششوں کے نتیجہ میں پیرس میں منعقدہ کانفرنس نے فلسطین کا انتظام وانصرام

برطانوی حکومت کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا بعد میں محطین اقوام نے بھی اس کی توثیق کر دی دراصل صیہونی تحریک کے رہنماؤں کو برطانیہ کے علاوہ کسی دوسرے فریق پر اعتماد نہیں تھا۔ درج ذیل اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"صیہونی تحریک کے حامیوں کی طرف سے کمیشن کو صیہونیت کے بارے میں کافی مواد مہیا کیا گیا تھا۔ کمیشن نے صیہونی نو آبادیوں اور ان کے وعدوں کے متعلق بہت کچھ سنا اور جو کچھ ہوا تھا وہ بھی ذاتی طور پر دیکھا۔ صیہونیوں کے عزائم اور منصوبوں میں پسند کرنے کی کئی باتیں ہیں۔ ہم نو آبادکاروں کے رہنماؤں اور بڑی قدرتی رکاوٹوں کو جدید طریقوں سے دور کرنے میں کامیابی سے بھی خوش ہوئے۔"(۱۲)

سلطنت عثمانیہ کے آخری فرمانبرواا ور عمل کو سلمٰی اعوان نے یوں پیش کیا ہے:

"تب دفعتاً سلطان کی آواز نے فضا میں ایک بار اور ارتعاش پیدا کیا۔

مجھے اعتراف ہے سلطان عبدالعزیز کے محلات کے تعمیری شوق نے سرکاری خزانے کو خالی کر دیا ہے۔ قرضوں کا بوجھ بہت زیادہ ہو گیا ہے مگر کوئی میرے وجود کے ٹکڑے ٹکڑے بھی کر دے تب بھی میں فلسطین کی سرزمین کا ایک انچ نہیں بیچوں گا۔" ایک پل کے لیے وہاں گفتگو جیسے ٹھہری پھر رواں ہوئی۔"(۱۳)

"تاج شاہی دستار کی صورت میں تھا۔ عباس شاہی ایک بڑے سے فرنمل نما گولڈن لبادے کی صورت متناسب وجود جس کے کھلے بازوؤں اور گلے کے گرد بنے سیاہ حاشیے جس کی پشت پر ٹنکے ہیروں اور جواہرات کی لشکارتے مارتی چمک سے ایموس کی آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں۔

"عثمانیہ سلطنت کا فرمانروا سلطان عبدالحمید ثانی دوزانو حالت میں دونوں بازو گھٹنوں پر رکھے اس پر بے حس و حرکت بیٹھا آنکھوں میں بلا کی چمک لیے انہیں دیکھتا تھا۔ کمرے میں سکوت تھا ہاں البتہ اس کے دل کی دھڑکن ضرور شور مچا رہی تھی۔ یہ ایک ایسا منظر تھا جس کا ایموس اپنی زندگی میں دیکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔"(۱۴)

دوسری عالمگیر جنگ کے خاتمہ کے ساتھ ہی عرب ممالک نے اپنی ایک الگ تنظیم بنانے کا فیصلہ کیا اس کا ایک بڑا مقصد ان ملکوں کے قومی اور اجتماعی مفادات اور آزادی کا تحفظ کرنا تھا۔ ہر ملک کو اہم معاملات میں حق استرداد حاصل ہے۔ لیگ کی متعدد خصوصی کمیٹیوں کو محض مشاورتی اختیارات تفویض کیے گئے ہیں لیگ کے منشور میں مختلف عرب ملکوں کے رضاکارانہ اضمام کی گنجائش ہے مگر اس ضمن میں اب تک جتنی کوششیں کی گئی ہیں وہ سب کی سب بے نتیجہ ثابت ہوئیں۔ عرب لیگ اندرونی تضادات کی وجہ سے کوئی موثر کردار ادا کرنے سے قاصر رہی ہے۔ عرب حکمرانوں کی باہمی رقابت اور عدم اعتماد یہ دو عناصر ہیں جنہوں نے تنظیم کو تقریباً مفلوج کر کے رکھ دیا۔ خاندانی اور قبائلی چپقلش تو تھی ہی تنظیم کے قیام کے دوسرے عشرے میں غریب اور امری عرب ملکوں کے درمیان معاشی مفادات کے تصادم نے صورت حال کو مزید خراب کر دیا۔ ایک طرف تو کویت اور سعودی عرب ہیں جو تیل کی دولت سے مالا مال ہیں اور دوسری

طرف تیل سے محروم ممالک گویا مالدار عرب ملکوں نے اب اپنی دولت کا کچھ حصہ دوسرے عرب ملکوں کے ترقیاتی منصوبوں میں لگانا شروع کیا ہے تاکہ ان کا احساس محرومی کم ہو مگر عمومی معاشی تضادات پوری طرح اثر انداز ہیں۔ ۱۹۶۰ اور اس کے بعد کے عشرے میں مختلف عرب ممالک کے درمیان ایک قسم کی نظریاتی جنگ بھی جاری ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ مشترکہ دشمن اسرائیل کی موجودگی بھی عرب دنیا کو متحد کرنے میں ناکام رہی ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ اگر عرب آپس میں متحد اور منظم ہوتے تو اسرائیل کو عرب ممالک کے خلاف یکے بعد دیگرے جارحیت کا ارتکاب کرنے کی جرأت نہ ہوتی اور پھر عالمی حلقوں میں عربوں کی آواز کو بھی کوئی وقعت دی جاتی۔

فلسطینی حریت پسندوں کی جدوجہد آزادی برسوں پر محیط ہے لیکن ابتدا میں یہ غیر منظم رہی حریت پسندوں کو ایک جگہ جمع کرنے کی تمام کوششیں کچھ غیروں کی سازشوں کا شکار ہوئیں تو کچھ اپنوں کی رقابت کا۔ اگر فلسطین کے عرب منظم ہوتے اور ان کی قیادت دور اندیش اور بے لوث افراد کے ہاتھ میں ہوتی اور ساتھ ہی اگر آزاد عرب مملکتیں نازک مواقع پر ان کی عملی حمایت کرتیں تو شاید آج فلسطین کا مسئلہ اس شکل میں موجود نہ ہوتا۔ مگر تاریخ ایسے مفروضوں کی پابند کہاں ہے۔ تنظیم آزادی فلسطین ۱۹۶۴ میں ہونے والی عرب سربراہ کانفرنس میں قائم کی گئی تھی اسی سال فلسطین کی فوج آزادی کا قیام عمل میں آیا عرب اور مسلمان ممالک کے علاوہ دنیا کے کم بیش ۱۲۰ ملکوں نے تنظیم آزادی فلسطین کو فلسطینی عوام کی واحد نمائندہ جماعت کی ہیئت تسلیم کر لیا۔ تنظیم کو عرب لیگ کی مکمل رکنیت حاصل ہے جبکہ اقوام متحدہ اور اس کے ذیلی اداروں میں اسے سفیر کا درجہ دیا گیا ہے ادھر سارے فلسطینی مزاحمتی گروپ تنظیم میں شامل ہیں۔ ایک گروپ الفتح کے نام سے پکارا جاتا ہے سب سے بڑا اور منظم گروپ یہی ہے ۱۹۵۷ میں تشکیل دیا گیا اس طرح اسے گوریلا تنظیموں میں اولیت کا شرف بھی حاصل ہے اس میں ہر مکتب فکر کے لوگ شامل ہیں۔ ''العاصفہ'' یہ الفتح کا عسکری بازو ہے۔ ''صاعقہ'' نظریاتی طور پر شام کے زیادہ قریب ہے اس کے علاوہ عرب کاذ آزادی، محاذ قومی جدوجہد محاذ آزاد وغیرہ جیسے گروپ شامل ہیں۔ ان میں سے بعض گروپس دوسرے گروپس کا حصہ بن کر ایک ہو چکے ہیں۔ مختلف عرب ممالک میں مہاجرین کی زندگی بسر کرنے کے باوجود فلسطینی پوری عرب دنیا میں سب سے زیادہ جمہوریت پسند کہے جاسکتے ہیں۔ یہی جمہوریت نوازی فلسطینیوں کو دوسرے عربوں سے ممتاز کرتی ہے اور یہی ان کی تحریک مزاحمت کی کامیابی کی ضامن بھی ہے۔ فلسطین میں اٹھنے والی بعض تحریکوں کو سلمٰی اعوان نے یوں پیش کیا ہے:

> "اگر کہیں امریکہ اور اس کا دم چھلا برطانیہ اسے سبز جھنڈی دکھا دیں اس کے سر پر سے شفقت بھرا ہاتھ اٹھالیں تو ہوش ٹھکانے آجائیں اس کے۔ تکلے کی طرح سیدھا ہو جائے۔"
>
> "ارے نہیں میری جان امریکہ اور برطانیہ کے بااثر ترین یہودیوں کی جان اس میں پھنسی ہوئی ہے تبھی تو یہ کسی بدمست سانڈ کی طرح ڈکراتا ہے۔ ۷۳ میں سادات نے سنہائی تک دھکیل کر ثابت کر دیا کہ یہ کوئی ایسی بھی قابل تسخیر شے نہیں۔"(۱۵)

تنظیم آزادی فلسطین کو سب سے بڑی سیاسی اور سفارتی کامیابی اس وقت حاصل ہوئی جب اقوام متحدہ کی جنوبی اسمبلی نے اسے

فلسطینی قوم کے نمائندے کی حیثیت سے تسلیم کیا، تجویز کے حق میں ایک سو پانچ اور مخالفت میں صرف چار ملکوں نے ووٹ دیا۔ بیس ملکوں نے رائے شماری میں حصہ نہیں لیا تھا۔ اس تحریک کے اصولوں سے فلسطینی انقلاب اور تحریک مزاحمت کے حقیقی خدوخال نمایاں نظر آتے ہیں جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔ فلسطینی عرب دنیا میں سب سے زیادہ حریت پسند جمہوریت نواز یا اصول سرفروش قوم ہے، کئی ملکوں میں منتشر ہونے کے باوجود تنظیم آزادی کے تمام فیصلے جمہوری اصولوں کے تحت کیے جاتے رہے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تحریک مزاحمت کے بنیادی اصولوں کے مطابق تنظیم آزادی فلسطین پر منصفانہ حل کو قبو کرنے پر آمادہ ہے لیکن وہ ایسے اقدام کی مخالفت ہے جس سے عربوں کے اتحاد یا خود تحریک آزادی پر کسی قسم کی زد پڑے۔ تحریک مزاحمت کی قیادت اس بات سے واقف صیہونیوں کا اصل مقصد عرب ممالک میں پھوٹ ڈال کر ان سے من مانی شرائط تسلیم کرانا ہے اور وہ اس میں کافی کامیاب بھی رہے ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ صحرائے سینا کا علاقہ اسرائیل سے واپس لینے سے مصر کو بڑی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی تھی اور اسی طرح دوسرے عرب ممالک بھی اسرائیل سے مڈبھیڑ میں اپنا کافی نقصان کروانے کے بعد خاموشی کے راستے پر عمل پیرا ہیں۔ تحریک مزاحمت کے حوالے سے لہو رنگ فلسطین کا درج ذیل اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> " تم کیا سمجھتے ہو۔ فلسطین سے بڑھ کر میرے لیے کون ہے۔ میرا سب کچھ فلسطین کے لیے ہی تو ہے۔"
> مجھے محسوس ہوتا کہ اس کے اندر اسرائیل کے لیے ایک آگ تھی۔ تم یقین کرو میرا جی چاہتا ہے میں اپنے وجود سے بم باندھ کر بیس اسرائیلیوں کو اڑادوں اور خود بھی اڑ جاؤں۔"(۱۶)

اسرائیلی مملکت کے نام نہاد قیام کے یک طرفہ اعلان کے ساتھ ہی صیہونیوں نے اپنے توسیع پسندانہ منصوبے پر عمل شروع کر دیا تھا۔ اقوام متحدہ کے فیصلے کے تحت فلسطین کا جو علاقہ عربوں کے لیے مختص کیا گیا تھا صیہونیوں نے اس پر بھی زبردستی قبضہ کر لیا۔ فلسطینی عربوں کی حمایت میں عرب لیگ کے رکن ممالک کی فوجیں میدان میں آئی تھیں مصر، شام اور اردن کے کہنے کو تو آزاد خود مختار ممالک تھے مگر ان کی عسکری قوت برائے نام تھی۔ دوسری طرف اگرچہ اسرائیلی مملکت تازہ تازہ وجود میں آئی تھی لیکن اس کی عسکری قوت کے دو مضبوط عناصر تھے اول وہ یہودی جو برطانوی فوج میں رہ کر جدید ترین اسلحہ کی تربیت حاصل کر چکے تھے دوم یہودی دہشت پسند تنظیمیں جن کے مکمل تربیت یافتہ اراکین کی تعداد ہزاروں تک پہنچی تھی ان کے پاس چوری چھپے درآمد کردہ اور خود فلسطین کے اندر زیر زمین فیکٹریوں میں بنایا گیا اسلحہ وافر مقدار میں موجود تھا اس طرح جنگ ہوئی جس میں عربوں کا ایک بڑا علاقہ اسرائیل کے قبضے میں چلا گیا۔ اقوام متحدہ نے عربوں اور اسرائیل کے درمیان جنگ بندی کا اہتمام کیا لیکن اس کا بڑا فائدہ اسرائیل کو ہی ہوا۔ بیت المقدس جسے تقسیم کے منصوبے کے تحت اقوام متحدہ کے زیر انتظام بین الاقوامی شہر قرار دیا گیا تھا اس کے ایک حصے پر اسرائیل نے قبضہ کر لیا جبکہ دوسرا حصہ اردن کے تسلط میں آگیا۔ درج ذیل اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> "دعائیں دیں امریکی صدر ٹرمین کو کہ جس نے فلسطینی صیہونیوں کے حوالے کیا۔ جس نے اقوام متحدہ کی یہ تقسیم جنرل

اسمبلی سے دباؤ کے تحت منظور کروائی۔ وگرنہ آپ کی کاوشیں، آپ کی دہائیاں اور آپ کے نعرے اور اعلان سب کہیں منہ چھپاتے ماتم رکر ہے ہوتے۔"

بیگن نے بڑی تیکھی نظروں سے اسے دیکھا۔"(۱۷)

اسرائیل اور عرب کے درمیان دوسری جنگ صرف انہیں تک محدود نہ رہی بلکہ برطانیہ اور فرانس بھی اپنی ساری عسکری قوت سمیت عملی طور پر اسرائیل کے ساتھ شریک تھے۔ اسرائیل اور اس کے سرپرست مغربی طاقتیں عربوں کو سبق سکھانے کا فیصلہ پہلے ہی کر چکی تھی اس جنگ میں شکست کھا جانے کے بعد عرب ملکوں نے صورت حال کا معرضی انداز میں جائزہ لیا اور اپنی اپنی عسکری طاقت اور معیشت کو نئے خطوط پر استوار کرنے کی کوشش شروع کی۔ عربوں نے دور رس اقتصادی اور سماجی اصلاحات بھی نافذ کیں مغربی ممالک کو یہ گوارانہ ہوا دریائے نیل پر اسوان بند کی تعمیر سے مصر کی معیشت کو ایک مضبوط بنیاد ملتی تھی، امریکہ و برطانیہ نے اس مقصد کے لیے ضروری مالی معاونت کا وعدہ کر لیا تھا مگر آخری وقت پر مکر گئے عربوں کے قومی وقار کا یہ مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ اپنے وسائل سے سرمایہ حاصل کرنے کی غرض سے مصری حکومت نے نہر سویز کو قومی مملکت میں لینے کا اعلان کر دیا۔ مصر کو اس کا قانونی اور اخلاقی حق تھا اور اس اقدام میں سامراجیوں کو ایک قسم کی تنبیہ بھی پوشیدہ تھی کہ عرب اپنے قومی وقار اور مفاد کے تحفظ کے لیے ہر قوت سے ٹکرا سکتے ہیں۔ اسرائیل نے اس بات پر حملہ کر دیا اور برطانیہ اور فرانس نے بھی اس کا کھل کر ساتھ دیا۔ اسی طرح ایک تیسری جنگ بھی اسرائیل کی جارحانہ سرگرمیوں کی وجہ سے ہوئی۔ اسرائیل نے عرب عسکری قوت کو یکجا نہی ہونے دیا اس حکمت عملی سے اسرائیل نے عربوں کے خلاف زبردست کامیابی حاصل کی۔ اقوام متحدہ میں عرب اسرائیل تنازعے کے حل کے لیے سفارتی سرگرمیاں ایک بار پھر زور پکڑ گئیں اور ایک قرارداد منظور ہوئی جس کے تحت مقبوضہ علاقوں سے اسرائیلی فوجیں بلا تاخیر واپس بلائی جائیں اور علاقے کے تمام ملکوں کے محفوظ اور مسلمہ حدود کے اندر امن سے رہنے کے حق کا احترام کیا جائے۔ لہو رنگ فلسطین کا درج ذیل اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"امریکہ نے اسرائیل کے ساتھ اپنا اپنا فوجی اتحاد وقتی طور پر ختم کر دیا ہے امریکہ آپ کا سب سے بڑا مربی اور خیر خواہ۔ آخر ایسا کیوں ہوا؟

بیگن کی نشتر زنی بہت تیز اور شدید تھی۔ امریکہ کی کرتوتوں اور اس کے کچے چٹھوں کا احوال میں نے سیموئل لیوٹسن (امریکی سفیر) کو اپنے گھر بلا کر اس کے گوش گزار کر دیا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ تم لوگوں کی تو وہ مثال ہے چھاج تو بولے سو بولے چھلنی بھی بولے جس میں بہتر بہتر سو چھید۔"(۱۸)

مستقبل میں ایک فلسطینی ریاست کا قیام ناگزیر ہے۔ اس جدید جمہوری مملکت کے قیام سے مغربی ایشیا کی پوری سیاست کا دھارا مڑ جائے گا اور اس کا اثر طاقت کے عالمی توازن پر بھی پڑے گا۔ ماضی سے حال اور پھر مستقبل کا سفر سلمٰی اعوان نے لہو رنگ میں بڑے جامع انداز میں بیان کیا ہے۔

حوالہ جات

1. سلمیٰ اعوان،ڈاکٹر ,''لہورنگ فلسطین'' دوست پبلشرز، اسلام آباد:۲۰۱۳، ص۱۱۹
2. ایضاً، ص۳۱۷
3. ایضاً، ص۱۱۰
4. ایضاً، ص۱۱۹
5. ایضاً، ص۱۰۸
6. ایضاً، ص۱۰۹
7. ایضاً، ص۱۰۹
8. ایضاً، ص۳۴۳
9. ایضاً، ص۲۷۹
10. برطانوی حکومت کے شائع کردہ قرطاس ابیض ۱۹۳۹ کی دستاویز نمبر ۵۹۶۴
11. دستاویز نمبر ۵۹۷۴، برطانوی قرطاس ابیض مورخہ ۱۶ مارچ ۱۹۳۹
12. [U.S department of state; papers relating to the foreign relations of the United States. The points piece conference 1919 (vol xii) Washington 1947]
13. ڈاکٹر سلمیٰ اعوان: ''لہورنگ فلسطین'' ص۳۰
14. ایضاً، ص۲۹
15. ایضاً، ص۳۷۔۳۸
16. ایضاً، ص۲۶۸
17. ایضاً، ۲۷۵
18. ایضاً، ۲۷۶